

حکمتِ قرآن

قسط نمبر ۳

حمید الدین فراہی
ترجمہ: خالد مسعود

(استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی ایک اہم غیر مطبوعہ تصنیف حکمۃ القرآن کی تیسری قسط 'تدبر' لاہور کے شکار کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔)
(ادارہ)

حکمتِ علم اور عمل کی جامع ہے :

ایک حکیم کے پاس جو علم ہوتا ہے وہ اس نے دوسروں کی تقلید کر کے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر حاصل کیا ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی فطرت کی آواز سنتا ہے کیونکہ اس کی فطرت دوسری تمام چیزوں کی نسبت اس سے قریب تر ہوتی ہے۔ اس کے استدلال کی بنیاد ظن و تخمین پر نہیں ہوتی، نہ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ محض چند اجزاء کو دیکھ کر ان سے عام کیلئے اخذ کر لے۔ اس کے برعکس وہ اشیاء کے تعلقات و لوازم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا اس کا اخذ کردہ نتیجہ اس کی بصیرت ہی کا ایک پہلو بن جاتا ہے۔

حکیم اگر کسی چیز میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ بھی کسی دوسری چیز کے حوالے سے نہیں ہوتی بلکہ وہ بلا واسطہ اسی چیز کی جستجو کرتا ہے جو اس کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ لذیذ چیز اور اس کی زندگی کا مقصد ہوتی ہے۔ علم و عمل میں جو لوگ پختہ کار ہوئے ہیں ان کا طرز عمل ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جو علم حاصل ہوا وہ ان کے سینے کی ٹھنڈکی بن گیا اور جس مطلوب کو انہوں نے اختیار کر لیا تو اس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، ان دونوں دولتوں کو انہوں نے خوب غور سمیٹا اور اس سے اطمینان پایا۔ ایسے ہی لوگ حقیقی عالم و عامل اور واقعی

مخلص ہوتے ہیں۔ ان کا علم نہ تو محض برائے علم ہوتا اور نہ بار و یا مردہ ہوتا ہے۔ یہ علم سراپا زندگی، جسم فوت اور شوق و عمل کا جامع ہوتا ہے۔ پس ایک حکیم نفس اور اس کی بیماریوں، دنیا اور اس کی ناپاکیوں، تقویٰ اور اس کی لذتوں اور شفا بخشیتوں سے واقف ہو جاتا اور اپنے رحیم کریم اور حکیم خدا کو پہچان جاتا ہے۔ وہ خدا پر ایمان لاتا، اس کی طرف مائل ہوتا اور اس کے جال و کمال کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ غفلت کی تلخیوں کو بھی جان جاتا ہے اس لیے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیتا ہے۔ اس کا علم، زندہ ایمان اور ایسا کامل یقین ہوتا ہے جیسے وہ غیب کا مشاہدہ یقین کی آنکھوں کے ساتھ کر رہا ہو۔ غیب کا یہ مشاہدہ اس مشاہدہ سے واضح تر ہوتا ہے جو وہ سر کی آنکھوں کے ساتھ کر سکتا ہے۔ ایک آدمی جب کسی خوبصورت حقیقت کو پایا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کو محبوب نہ بنائے لہذا ایمان کے نتیجہ میں اللہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

جو لوگ ایمان لائے وہ سب سے زیادہ

(بقرہ: ۱۷۵) خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اس آیت میں حقیقی ایمان ہی کو حُب کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان جب جب خدا کو یاد کرتے ہیں وہ اس کی عظمت و کبریائی سے مرعوب ہو جاتے ہیں اس سے ان کے دل کانپ جاتے ہیں، خدا کی بزرگی اور اس کا جلال ان پر روشن ہو جاتا ہے، لہذا وہ اس کی طرف اڑ کر پہنچتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی رضا کے حوالے کر دیتے ہیں۔

إِذَا تُدْعُوا لِلدِّينِ إِذَا دُكِرَ
اللَّهُ وَحُجِّلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تَلَيَّتْ
عَلَيْهِمْ أَيْتَاتُ رَأْسِهِمْ رَأَيْتُمْ
مُؤْمِنِينَ تَوَدُّ هِيَ كَيْفَ جَبَّ اللَّهُ كَذَلِكَ
جَاءَ ان کے دل دہل جائیں اور جب
اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ
ان کے ایمان میں اضافہ کریں۔

حکمت کی نشوونما کی شرائط :

حکمت دل کی زندگی ہے۔ زرخیز زمین کے اندر بیج ڈالا جائے تو وہ اگتا ہے اسی طرح دل زندہ اندر علم کا بیج نشوونما پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس دل میں علم کو زندگی ملے اور وہ

نشوونما پانے والے بیج کی طرح پھلنے پھولنے لگے تو یہ دل کی زرخیزی کی ایک دلیل ہے۔ علم کی زندگی کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اس کو اپنے حال پر طاری کر لے اور اس کے نتیجے میں عمل صالح اختیار کرے۔ یہی نشوونما تو یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی صرف حرکت پیدا کرنے والی چیز ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں ایک خاص ترتیب اور نظام کا پایا جانا ضروری ہے۔ کوئی زندہ شے ایسی نہیں جس میں نظام نہ ہو، لہذا ایک منظم علم کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا حسن، اس کی رونق اور اس کا نفع ہوتا ہے۔ دل کی زندگی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر علم کی نشوونما کی صلاحیت موجود ہو۔ گویا اصل معاملہ دل کی زندگی ہی کا ہے۔

حکمت کا معاملہ یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو عطا نہیں کی جاتی جو اس کو پانے کا اہل نہ ہو۔ اس کا سبب یہ ہیں کہ ایک حکیم دوسروں تک اس کے پہنچانے میں بخل سے کام لیتا ہے بلکہ حقیقت میں وہ اس کے لیے غیرت رکھتا ہے اور غلط فہمی کے نتیجے میں اس کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر بجز زمین میں بیج ڈال دیا جائے تو وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر علم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر یہ نفع نہ دے تو نقصان پہنچانے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اسی لیے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اللهم انی اعوذ بک من علم لا ینفع وقلب لا یشع
اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں
اس علم سے جو نفع نہ دے اور اس دل
سے جو عاجزی اختیار نہ کرے۔

آنحضرتؐ کی یہ دعا اس عظیم حقیقت پر بھی دلیل ہے کہ اگر دل خشوع کی صفت سے خالی ہو تو آدمی کا علم اس کو کوئی نفع نہیں دیتا۔ یہیں سے ہیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کون سی چیز دل کو زندہ رکھتی اور اس میں حکمت کو قبول کرنے کی صلاحیت کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ اصل میں دل کا خشوع وہ دروازہ ہے جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہوتی ہے۔ یہ حکمت کو پانے کی شرطِ اول ہے اور اس کی تصریح قرآنِ مجید اور حدیثِ صحیح دونوں سے ہوتی ہے لہذا ہمارے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ خشوع حاصل کیسے ہوتا ہے اور حکمت کے حصول کے لیے دل کو کیسے تیار کیا جاتا ہے۔

ایک غور کرنے والا شخص جب آسمان، زمین اور انفس میں خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور رحمت کا مشاہدہ کرتا ہے، پھر اپنے نفس کو دیکھتا ہے کہ وہ انتہائی بلندی اور انتہائی پستی کے درمیان رکھ دیا گیا ہے تو یہ چیز اس کے اندر خدا کی خشیت اور امید ساتھ ساتھ پیدا کرتی ہے۔ پھر اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے، اس کا پیدا کرنے والا عادل اور ایک پاکیزہ رب ہے۔ اس کے بالمقابل وہ خود غلط کار، بھٹکنے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر اس قدر خشیت پیدا کرتا ہے کہ وہ غلوت و جلوت میں حدودِ الہی کی پابندی کرنے لگتا ہے۔ وہ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ خشیت اور تقویٰ کی ان صفات سے اس کا قلب صاف ہوتا اور حکمت کے نور کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کتاب الامثال میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ حقیقت بیان فرمائی کہ حکمت کا سرا رب کی خشیت ہے۔

اسی خشیت اور تقویٰ کے نتیجہ میں بندہ خشوع اور فروتنی کا لباس اوڑھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ساری بادشاہی تھاں اس کے منہم رب کی ہے اور وہ اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ رب سے دُور ہونے سے ڈرتا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے۔ وہ اسی سے طالب ہوتا اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ اس خشوع کے نتیجہ میں آدمی کے اندر علم کی تعظیم اور اس کے بارے میں حسن ظن پیدا ہوتا ہے اور اعتراض کرنے کی روش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز حکمت کی نشوونما کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہے اور یہ خشوع رفع درجات کا ذریعہ بنتا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَإِذْ أُنْزِلَ الْإِنْشِرَافُ فَانْشَرَوْا وَيَنْفَعِ
اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ
(مُؤْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ)
اور جب کہا جائے کہ (مجلس سے) اٹھ
جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ اللہ ان لوگوں کے
جو تم میں سے اہل ایمان ہیں اور جن کو
علم عطا ہوا ہے، مدارج بلند کرے گا۔
(المجادلہ: ۱۱)

اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ اس آیت میں بھی ہے:

فَأَسْكِنِي مَسْبُلٌ رَيْكُ ذُلًّا
پھر اپنے پروردگار کے ہموار ستوں پر چل۔

حکمت بالتدرج حاصل ہوتی ہے :

حکمت کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ یکبارگی یہ کبھی حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ مختلف مواقع پر آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح مکان یکبارگی تعمیر نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے نہ جانے کتنے پاؤں پیلے پڑتے ہیں اسی طرح کامیاب حصولِ حکمت کی راہ میں پیش آتا ہے۔ غذا کو بڑی مقدار میں ایک ہی دفعہ معدے میں ڈالنے کی کوشش کی جائے تو معدہ اس کو قبول نہیں کرتا اور وہ مائع جاتی ہے اسی طرح قلب کے اندر بھی حکمت کو ایک ہی مرتبہ میں اٹھالینے کی طاقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو یکبارگی نہیں اتارا گیا۔ اس کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ :

لَقَدْ نَزَّلْنَاهُ بِحَقِّ مَقَالٍ ۚ وَرَقَّلْنَاهُ
فَرَجًّا ۚ
(الفرقان: ۳۲) تدریج و اہتمام کے ساتھ اُتارا ہے۔

حکمت کی تعلیم دینے والا بھی اس طریقہ کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ مختصر کلام کرتا ہے تاکہ شاگرد اس پر جلدی سے نہ گزر جائے بلکہ اس کو سمجھنے کے لیے مزید شرح و تفصیل کا خواہشمند استاد کا محتاج اور اس کے ساتھ طویل صحبت کا طالب ہو۔

نظمِ قرآن صرف اہل شخص پر رکھتا ہے :

اسی حقیقت کے فہم ہے میری رہنمائی قرآن مجید کے نظم کی حکمت کی طرف ہوئی ہے قرآن نے اپنی تعلیم کے لیے کئی طریقے اختیار کیے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ہر ہر آیت کو ایک مستقل تعلیم کا حامل بنایا ہے۔ جب آدمی ایک تنہا آیت کو عمل تدبیر بناتا ہے تو اس کو اسی پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہوئی جیسے کارخانوں کے کارکنوں کے لیے ایک مخصوص شعبہ ہی میں مشغولیت کافی سمجھی جاتی ہے۔ اگر کارخانے کا پورا نظام ان پر کھول دیا جائے تو وہ تشدد رہ جائیں اور ان کے لیے وہ کام کرنا بھی مشکل

ہو جائے جس کے کرنے کی وہ اہلیت رکھتے ہیں۔ کامل نظام ہمیشہ اس شخص پر کھولا جاتا ہے جو اس کو سمجھنے کا اہل ہوتا ہے۔ کارخانے کے کارکن کی طرح فوج کا ایک سپاہی اپنے مورچے پر ڈیوٹی کے لیے کافی ہوتا ہے اور وہ اس سے ہٹ کر اس سے زائد کسی چیز کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا۔ لڑائی کا پورا نقشہ صرف کمانڈر کے پاس ہوتا ہے اور وہی اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بناء پر بہت سے لوگوں نے قرآن سے معمولی واقفیت پر قناعت کر لی اور اس کے اجزاء کے باہمی ربط کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن جو شخص حکمت کی کسی وادی کا آشنا ہو جاتا ہے وہ قرآن کے مجموعی نظم کی طرف رہنمائی پاتا ہے۔ اس کی نظر میں مجموعہ آیات کی خوبیاں، بلند حقائقِ علمی، علومِ الہیہ کے مختلف شعبوں کا نقطہٴ جامعہ اور کتاب اللہ سے حاصل ہونے والی شفاءِ کلی، ہر چیز سما جاتی ہے۔

مسلمانوں کے اولوالامر کے لیے نظم قرآن سے واقف ہونا ضروری ہے:

اوپر کی بحث سے ہم اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات جس شخص کے حوالہ کیے گئے ہوں، اس کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ کتاب کے نظم سے بے خبر رہے کیونکہ اس کے لیے اصل رہنما قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا حال یہ ہے کہ وہ قرآن کے متفرق امور ہی سے واقفیت رکھتا ہو اور صفات کے مدارج اور نظام سے بے بہرہ ہو تو ایسا ایڈرافٹ و تفریط کے درمیان ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اس کا اجتہاد جانبداری پر مبنی اور حق سے دور کرنے والا ہو گا۔

ظواہرِ شریعت اور ان کے اصول و حقائق کے مابین وہی تعلق ہے جو علوم اور ان کے خواص و علماء کے مابین ہے۔ جس طرح علوم اپنے خواص پر غالب نظر آتے ہیں اسی طرح ظواہرِ شریعت دین کی روح پر غالب نظر آتے ہیں۔ اس بات کو ہادی علیہ السلام نے اچھی طرح واضح فرمایا۔ آپ نے خوارج کے معاملہ میں اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ملت کا نظام خراب اس وقت ہوتا ہے جب اثرِ ارک و غلبہ حاصل ہو جائے۔ ان کے ملے عوام پر ظاہری امور میں تجارتی رہتے ہی ہیں اور یہ ان کی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش

کرتے ہیں لیکن بعد میں ان کو ان لوگوں کی تائید بھی حاصل ہو جاتی ہے جن کی عقلیں کوتاہ لیکن کام کرنے میں وہ بہت تیز ہوتے ہیں۔ اس طرح اشرا غلبہ پا کر ملت کی تنظیم کو بارہ بارہ کر دیتے ہیں۔

ادھر ہم نے دین دار لیکن جاہل لوگوں کے غلبہ کے نتائج بیان کیے تھے اور اب اشرا کے غلبہ کی مضرت واضح کی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس صاحب امر نے فرع کو اصل کی جگہ دے دی اور پست کو بلند کا درجہ دیا اس نے ملت کے نظام کو منتشر کر دیا۔ اس سے نظم قرآن کو سمجھنے کا فائدہ اور اس سے بے خبری کا نقصان واضح ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کی اصلاح (اور اس کے ساتھ دوسری امتوں کی اصلاح) اسی حکمت سے ہوگی جس کی طرف قرآن رہنمائی دیتا ہے۔ اس حکمت تک پہنچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ آدمی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے شاندار نظم کے اندر کیا کیا معارف رکھ دیے ہیں۔ جو شخص نظم کا لحاظ رکھے بغیر حکمت قرآن کو جاننا چاہے گا۔ وہ کتاب اللہ کے فہم میں ٹانگ ڈالیاں مارتا رہے گا اور اپنی تدابیر میں مگر اسی میں پڑ جائے گا۔

نظام دین کی حکمت :

حکمت کی تعمیر اس اساس پر ہوتی ہے کہ ہستی کے مختلف اجزاء کے درمیان موافقت کی نوعیت معلوم ہو۔ یہ علم اس وقت حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کائنات کے نظام کو نہ سمجھا جائے اور یہ نظام اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ اس کے تمام اجزاء ایک ہی نظام کے اجزاء ہیں۔ دو یا دو سے زیادہ چیزوں میں جب بھی موافقت کے پہلو تلاش کیے جائیں تو اس موافقت کی ایک خصوصیت سامنے رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ مثلاً آپ زید کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوتے ہیں لیکن آپ کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ وہ عمرو کا باپ بھی ہے۔ گویا کسی بھی نظام رکھنے والی چیز میں ہمہ دانی ممکن نہیں۔ یہ حقیقت بھی جانی پہچانی ہے کہ آپ ایک جملہ کے ہر جزو کا موقع و محل اور تمام اجزاء کی باہمی نسبت جاننے بغیر جملہ کے معنی نہیں سمجھ سکتے، محض الفاظ کے معنی جاننا فہم کلام میں اس وقت تک مفید

نہیں ہوتا جب تک کہ پورا جملہ سمجھ میں نہ آئے بلکہ جب تک آدمی جملہ کے صحیح معنی کو اخذ نہ کرے اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی تک بھی اس کی رسائی ممکن نہیں ہوتی، ٹھیک اسی طرح اس حکیم کو بھی مشکل پیش آتی ہے جو پوری کائنات کے نظام اور اس کے اندر موجود وحدت پر غور کر رہا ہوتا ہے۔

نظام کائنات کی وحدت :

کائنات میں صرف ایک ہی نظام اور ایک ہی مسلسل نعمت کا ظہور ہے۔ اس میں جو تضاد نظر آتا ہے یا تو وہ خیر ہی کو برآمد کرنے کے لیے ہے یا وہ جوڑوں جوڑوں میں موازنت کے نہ سمجھنے کے باعث ہے جس کے نتیجہ میں کائنات کے اندر پائے جانے والے فساد اور شر کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھ لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اعداد کا حوالہ بہت زیادہ دیا ہے لیکن ان کے جوڑے ملا کر بتایا ہے کہ ان اعداد سے کس طرح خیر کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک حکیم جب اعداد پر غور کرتا ہے تو وہ بھی ان کی منفعت اور ان میں خیر کے پہلوؤں پر لگا رکھتا ہے۔ اس معاملہ میں قدماء کا طریقہ بھی یہی تھا اور ان کے بعد ہر زمانے کے حکما بھی اسی طرح غور کرتے رہے۔ حافظ نے کہا ہے

نیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم و بیش
کہ من این مسئلہ بے چون و چرا یسیسم

کائنات کا خالق کامل ہستی ہے :

کائنات میں جس ہستی کا وجود لازم ہے وہ صفت کمال رکھتی ہے۔ جب بعض وجود نہ چھپا رہ سکتا اور نہ بے کار رہ سکتا ہے تو پھر کامل ہستی کیسے معطل و مخفی رہ سکتی تھی۔ لہذا اس کا تقاضا ہوا کہ ایجاد کرے۔ ایجاد وہاں ہوتی ہے جہاں پہلے کچھ نہ ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حرکت کے تصور کے لیے پہلے سکون کا تصور ضروری ہے پس قدیم ذات نے عدم کو وجود کا، سکون کو حرکت کا، تاریکی کو روشنی کا، کمزوری کو قوت کا، ہستی کو بلندی کا اور جبر

کو اختیار کا جامہ پہنایا۔ اس نے تخلیق کیا، اشیاء کو نمودار کیا، خلق پر شفقت اور کرم کیا اس کو علم اور عزت دی۔ اس نے انسان کے اندر علم اور جہالت، محبت اور بغض، سخاوت اور بخل کی متعادل صفات کا استخراج رکھا جس کے باعث اس کو کوشش، محنت اور شفقت اور ترقی اور نشوونما کا وسیع میدان میسر آگیا۔ پس ناقص کے لیے کمال، کمزور کے لیے قوت جہالت کے مقابلہ میں علم اور شک کے مقابلہ میں یقین کا حصول مقصود قرار پایا۔ لیکن اولین ہستی ہی آخری ہستی بھی ہے اور باقی سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اس بات کو یوں فرمایا:

وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ
الْعَالَمِينَ وَالْأَرْضِ۔

اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور

(آل عمران: ۱۸) زمین کی وراثت ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پہلے تھا۔ باقی سب اس کی مخلوق ہے۔ یہ سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان سب کا سرخ اسی کی جانب ہے اور وہی ان کا مقصود ہے۔

کامل وجود کے لیے لازم ہے کہ وہ قدیم، باقی رہنے والا، ازلی اور ابدی ہو، اس کی قوت اور پاکیزگی کمال کو پہنچی ہوئی ہو، لہذا اس نے جو کچھ چاہا وہ خیر ہے، جو کچھ واقع ہوا وہ خوب صورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر جس طرح ہستی اس پر ختم ہوتی ہے اسی طرح خیر و خوبی بھی اس پر ختم ہے۔ اگر یہ بات نہ مانی جائے تو اس کے وجود کا کمال مجروح ہوتا ہے پس:

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ

الْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

(الحمد: ۳) کا علم رکھنے والا ہے۔

نظام دین کی حکمت کی ضرورت :

اس بنیاد پر اب دین کے معاملہ پر نگاہ ڈالے۔ دین اگر صحیح ہو تو لازماً اس کا نظام بھی صحیح ہونا چاہیئے۔ نظام کے صحیح ہونے سے مراد یہ ہے کہ دین کے عقائد اور اعمال کے

درمیان دین اور فطرت انسانی کے درمیان اور دین اور کائنات کے درمیان کامل موافقت ہو، جب یہ سب موافقتیں صحیح ہوں گی تو ایسا دین پُر حکمت، فطری اور سیدھا سادا ہوگا جو ہمیں حکیم رب کی راہ دکھائے گا اور جو شخص اس کی حکمت سے واقف ہو کر اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا، وہ لزیر بصیرت پر ہوگا۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک عالم کی ایک ایسے عبادت گزار پر فضیلت کیوں بتائی گئی ہے جس کی ظاہری عبادت میں کوئی خلل یا نقص نہیں ہوتا۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں ہے کہ عابد فرائض و سنن اور ادا مروا ہی کے جاننے میں عالم کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے علم کے بغیر تو عبادت کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ہر عابد ظاہری احکام کا عالم تو ہوتا ہی ہے۔ اگر وہ عالم نہیں ہوتا تو دین کی حقیقتوں کا عالم نہیں ہوتا۔ لہذا وہ اپنے رب کی عبادت اس طرح نہیں کرتا جس طرح کرنا چاہیے۔ لہذا دین کی حکمت جاننے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے حتیٰ ایک بے خبر آدمی گمان کر سکتا ہے۔ اپنے اس مقالہ میں ہم دین اسلام کی ہیئتِ کلی پر روشنی ڈالیں گے، خارج سے اس کی نسبت کو بیان کریں گے اور اس کے داخلی اجزاء کی باہمی نسبتوں اور ان کی تقدیم و تاخیر کے مواقع کی وضاحت کریں گے تاکہ ان کے اجزاء کا باہمی ربط اور خارج کے ساتھ ان کی موافقت معلوم ہو اور ہم یہ جان سکیں کہ حق کے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں ہیں:

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفٰوُتٍ ۚ
فَارِئِجْ بَصْرَكَ ۚ لَ تَرَىٰ فِي خُطُوٰرِ
تَمَّ خَدَائِعُ رَحْمٰنٍ كِي صِفَتٍ مِّنْ كَوْنٍ
خَلَلٌ نِّهَيْسَ بَاؤُ كَمَنَ كَاہ دَوْرًاؤُ تَوَكِيَا
تَمِيں كَوْنِي نَقْصَ نَظَرٍ آتَا ہ ؟ (الملك: ۳)

پس ہم قرآن اور فطرت انسانی کے درمیان توافق، خلق اور امر کے درمیان توافق اور رب عزیز و حکیم اور انسان جس کو اس نے بہترین ساخت عطا فرمائی ہے، کے درمیان تعلق کو واضح کریں گے۔ اس کے تجو کے طور پر انسان اور تمام مخلوقات کے درمیان تعلق معلوم ہوگا جیسا کہ قدیم فلاسفر نے کہا ہے کہ انسان عالم اکبر ہے۔ لیکن ہم یہ توافق اپنی تاویل کے مطابق بتائیں گے جس میں ارادہ کرنے والے اور اس کے ارادہ کے درمیان، فعل اور اس کے مقصد کے درمیان

مفعول اور اس کے ذریعہ کے درمیان ذات اور اس کی صفات کے درمیان اور جو چیز طاقت میں ہوتی ہے اور جو عطا ظاہر ہوتی ہے اس کے درمیان موافقت واضح ہوگی۔ کیونکہ انسان کا موقف دو حالتوں کے درمیان رہتا ہے، یا تو وہ موافقتوں کے وجود ہی کا انکار کر دے گا یا وہ ان کا یقین رکھے گا۔ البتہ ان موافقتوں کے اجزا کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی کو ان کی باہمی نسبت معلوم نہ ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے نظام کی پہچان سے تعبیر کیا ہے۔

ہدایت و ضلالت :

قرآن نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ حقیقی دین صرف اسلام ہے اور یہی اصل فطرت ہے۔ اسی طرح اس نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ قرآن اصل ہدایت ہے یہی رب کی راہ دکھاتا ہے اور دین فطرت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح اس نے قرآن اور انسان کے درمیان موافقت اور خلق اور امر کے درمیان موافقت کو واضح کیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا :

(عَطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ) اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا

فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔ (طہ : ۵۰)

(الَّذِي خَلَقَ قَسْوَىٰ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهْدَىٰ) جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پلک

سنوارے، جس نے مقدر کیا اور (الاعلا : ۲-۳)

ہدایت بخشی۔

آیت میں لفظ سَوَّىٰ آیا ہے بتو یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کے تمام اجزا کو ایک دوسرے کے لیے موزوں اور مناسب اور ایک مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنایا جائے تاکہ اس کے بعد ان کے استعمال سے اس مقصد کو پورا کیا جاسکے۔ خلقت کو خوب بنانے اور حکم کرنے کا مفہوم بھی یہی ہے جیسا کہ ان آیات میں ہے۔

(أَحَسَّ كُلَّ شَيْءٍ بِخَلْقِهِ) اس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی

(السموہ : ۷) بنائی ہے۔

اَفْتَنُ مَحْيًى شَيْءٍ (النمل: ۸۸) اس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

آیات کے مفہوم نہایت واضح ہیں۔ اسی میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جس ذات نے پیدا کیا اسی نے ہدایت کا سامان بھی کیا اور جب وہ ہدایت دیتا ہے تو وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو، لہذا فرمایا:

اَلَا اِنَّهُ خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَابْلَغَ فِيْهِ حَقْلًا (الاعراف: ۵۴) آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص

ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی ہدایت انسان کی اس ساخت اور فطرت کے موافق ہے جس پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے تو وہ اللہ کی ہدایت ہے اور اس کے راستہ اور ارادہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ مزید اس نے ہمارے نفوس کے اندر اس کی پہچان بھی رکھ دی ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں ہدٰی کے معنی یہ ہیں کہ خالق نے جس طرح ہر شے کو کسی نفع اور استعمال کے لیے پیدا کیا اسی طرح اس نے جن مقاصد کے لیے وہ شے بنائی ان کے حصول کے لیے اس کو رہنمائی بھی عطا کی۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انسان کو ہر شے کی تفصیل کا علم بھی ہوا۔ اس کے لیے اولاً اتنی بات کافی ہے کہ وہ ان مناسبتوں کو جانتا ہو جو اس کے اور اس شے کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ وہ ان کو جمع کر کے ایک لڑی میں پروئے۔ ثانیاً تفصیل سے اتنا آگاہ ہو جتنا اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کے لیے وہ اس کا محتاج ہے اس طرح وہ کائنات کی دوسری تمام اشیاء کی طرح اس ذات کے ارادہ کے مطابق چل سکے گا۔ جس کی گرفت میں ساری کائنات کی باگ ہے۔

كُلٌّ فِیْ ذٰلِكَ لَیْسَبْحُوْنَ ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش

(یس: ۴۰) کرتا ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنِّیْ رَاسُخٌ فِیْہِمْ کہہ دو کہ ہر ایک اپنی روش پر کام کرے

(الاسراء: ۸۴) لگا۔

اگر انسان اس علم کے خلاف چلے تو وہ اپنی فطرت کی مخالفت کرتا اور اپنے خالق کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔ البتہ وہ خالق کے بنائے ہوئے مضبوط نظام سے باہر نہیں نکل سکتا اور

اس کے امر پر غلبہ پاسکتا ہے۔ کیونکہ خالق نے جس طرح ہر مخلوق کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا ہے اسی طرح اس نے انتظام بھی ٹھہرا رکھا ہے۔ اس نے انسان کو اختیار دیا تو خیر اور شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیت تو دے دی لیکن خیر و شر میں سے کسی ایک پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن چونکہ اس نے انسان کو صاحب اختیار بنایا تھا، اب اگر وہ اس کو کسی بات پر مجبور کرتا تو وہ خود اپنے پر حکمت اور برصفت ارادہ کے خلاف کرتا اور انسان کو اس نے جو آزادی عطا کی تھی اور اپنا قرب اس کو عنایت کرنے کے لیے اس کی آزمائش کا جو نظام بنایا تھا وہ خود اس کو توڑ دیتا۔ اس کے برعکس اگر انسان خود ہی اپنی فطرت کی نافرمانی کرتا اور اس کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹتا ہے تو وہ اس انجام سے دوچار ہوتا ہے جو اس نے اپنے نفس کے لیے خود اختیار کیا، البتہ اس طرح خالق کا ارادہ پورا ہو جاتا ہے۔

ہدایت و ضلالت کا یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کے لیے مزید قدیم ثابت ہوا ہے اور مذاہب پر اس کے اثرات نہایت گہرے پڑے ہیں۔ اس پر نہایت تفصیل سے کلام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ مناسب موقع نہیں یہاں اس سے صرف اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ ایک حکیم کے لیے کائنات اور اپنے نفس کی معرفت ضروری ہے تاکہ وہ اس نظام کُلّی کو جان سکے جس کے تحت دین کا نظام آتا ہے۔

مقصدِ حیات و کمالِ سعادت :

نفسِ انسانی کی جدوجہد کی غایت دو چیزیں ہیں، ایک ان قوتوں اور صلاحیتوں میں کمال حاصل کرنا ہے جو اس کو ودیعت کی گئی ہیں۔ دوسری اس مقصد کو پانا جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

جو چیزیں ودیعت کی گئی ہیں اور ان کی تکمیل مقصود ہے۔ وہ علم و عمل کی دو قوتوں اور فہم و اخلاق کو نشوونما دیتا ہے۔ علم اور فہم کا کمال یہ ہے کہ آدمی نور و ظلمت، حق و باطل اور ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے لگے اور عمل و اخلاق کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مادی جسم کی

گھٹیا جاتوں سے بلند ہو کر اپنی روح کی اعلیٰ پسند کو اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس کو ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے کی صلاحیت دی ہے جیسا کہ اس کو نیکی کے کام کرنے اور گھٹیا فانی چیزوں پر اعلیٰ اور پائیدار چیزوں کو ترجیح دینے کے اسباب سے بہرہ مند فرمایا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو سمیع و بصیر اور خدا کی صلاحیتیں عطا کیں۔ پھر اس کی طرف روشنی اتاری اور رسول بھیجے جب کہ اس کو اتنی صلاحیت دے رکھی تھی کہ جو چیز اس کے آگے رکھی جائے وہ اس کو پہچان سکے۔ اگر وہ نفس کی فطرت کے مطابق اس کو اسباب فراہم نہ کرتا تو انسان اس پیغام کے قبول کرنے کا مستکف نہ ہوتا جو اس کی طرف بھیجا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو مقصود مقرر کیا ہے وہ اپنے رب کی اطاعت و نفسِ خواہ ناگواری کے ساتھ ہی ہو، اس کے فیصلہ پر راضی رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے رب کے تقرب کے لیے اپنے وجود کے تقاضوں سے بھی دست بردار ہو جائے۔ جب انسانی اسی حالت میں اطمینان پائے اور اسی پر راضی ہو جائے تو اس کا رب اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوقات اس کی عبادت کرتی ہیں لیکن انسان جب عبادت کرتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی ساخت کے مخالف بات ہوتی ہے اس لیے اس کی یہ جدوجہد اور محنت نہایت کامل اور بڑی ہوتی ہے۔ اس کی شان یوں ہے جیسے وہ اپنے رب کی امانت کو ادا کرنے کے لیے ایک ایسی راہ پر چل رہا ہو جس میں چوروں، درندوں، رکاوٹوں اور پھسلن سے گھرا ہوا ہو بلکہ اس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنے وجود کی مخالفت کے باوجود اپنے رب کی طرف چل پڑا ہو، وہ خود اپنے نفس کا دشمن ہو جائے، اس کے ساتھ کشمکش کرے اور اس پر غالب آجائے۔ پھر اس کو قتل کر کے اپنے موٹی کے آگے ڈال دے۔

اوپر ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے آیت امانت

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ	ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین
وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ	اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں
يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا
الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا	اور اس سے ڈرے اور انسان نے

جھوٹا۔ اس کو اٹھایا۔ بیشک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے منسوب ہو جانے والا ہے۔ (الاحزاب: ۲۰)

کی تادیل روشن ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی طبیعت کا یہ گھٹیا پہلو ہی ہے جو اصل میں اس کے تقرب کا موجب ہوا ہے۔ کوئی مجاہد اس وقت تک مجاہد نہیں ہوتا جب تک اس کا کوئی ایسا دشمن نہ ہو جس پر وہ غلبہ پانے کی جدوجہد کرے۔ کوئی مقرب بندہ اس وقت تک مقرب نہیں کہلاتا جب تک وہ قربانی کو ذبح نہ کرے۔ یہاں قربان کی جانے والی چیز نفس اور اس کی خواہش ہوتی ہے پس کسی دوسری مخلوق کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا جو انسان کو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کسی کی وہ عزت ہو سکتی ہے جو اس کی عزت ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو تخلیق کرنے کے بعد اس کے اپنی طرف عروج کے لیے ایک زینہ مقرر فرما دیا اور اس کو نہم اور اختیار کی آزادی کی جو خصوصیات عطا فرمائی تھیں ان میں اس کی ابتلا رکھ دی۔

ابتلا کی حکمت :

انسان کی ابتلا آرام و آسائش اور تکلیف دونوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی اس کا شکر بھی جانچا جاتا ہے اور صبر بھی شکر کی صورت میں وہ خلق کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ اسی لیے ناشکری کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے :

كَلَّا بَلْ لَآتِكُم مِّنَ الْيَتِيمِ وَلَا تَحْضُوْنَ اَعْلٰی طَعَامِ الْمَسْكِيْنَ وَتَاْكُلُوْنَ الشَّرَآثَ اَكَلًا لِّثَامًا وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَبًا۔

ہرگز نہیں بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر ایک دوسرے کو ابھارتے اور وراثت کو سمیٹ کر ٹپ کرتے ہو اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔

(الفجر: ۱۷-۲۰)

صبر کی صورت میں انسان کو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کی طرف خیر کو واپس لانے والا رب

تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کی اپنی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کرے تاکہ وہ اس کو بدلہ عطا فرمائے۔ اس حقیقت کو یوں فرمایا:

وَإِذَا أَصَابْتُم مَّصِيبَةً قَالُوا
إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔
(البقرہ: ۱۵۶)

اور جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے
تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی
کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف
لوٹنے والے ہیں۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا
دُفِعُوا بِهَا آيَةً قَالُوا سَاءَ مَا
يَحْكُمُ بَيْنَنَا۔

جو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے
ان کو ان کا صلہ بے حساب پورا کیا

جائے گا۔ (الزمر: ۱۰)

پس صبر ترقی کا زینہ ہے اور شکر اخلاص، عبادت گزاری، دعا اور عاجزی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جب ایک بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کا رب نہایت رحیم و کریم ہے تو وہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو جاتا اور اس کی راہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث کرتا ہے، وہ اس کی طرف سکون پاتا ہے، دوسرے بندوں کے لیے شفقت کے جذبات رکھتا ہے اور یہ سب کچھ اطاعت کے جذبہ سے کرتا ہے تاکہ اپنے رب کو راضی کر لے۔ صبر و شکر کی دو بنیادی صفات میں جس قدر غور کیا جائے یہ حقیقتیں اسی قدر کھلتی جاتی ہیں۔

حاشیہ

۱۔ مصنف علیہ الرحمۃ کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مال بعض سرداروں میں تقسیم فرما رہے تھے۔ آپ کا مقصد ان کی تالیف قلب کر کے ان کو اسلام کا حامی بنانا تھا اس پر ایک شخص نے آگے بڑھ کر آپ کو ٹوٹا اور کہا کہ آپ عدل سے کام لیں حضورؐ نے فرمایا کہ آسمان و زمین کے رب نے میرے اوپر اتمام دیا ہے اور وہ صبح و شام وحی کی امانت میرے حوالہ کرتا ہے، میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ یا حضرت خالدؓ بن ولید اٹھے اور اس معترض شخص کی گردن مارنے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے منع کر دیا اور فرمایا کہ اس تماشے کے لوگوں کی ظاہری نمازیں

ایسی ہیں کہ تہداری نمازیں ان کے آگے شرعاً جائیں۔ یہ قرآن مجید کی شاندار قرأت کرتے ہیں لیکن وہ ان کے گلے سے اوپر اوپر ہی رہتا ہے۔ یہ لوگ ظاہری نیکی کے باوجود دین سے نکل جانے والے ہیں۔ یہ حدیث مختلف واسطوں سے صحیح مسلم کی کتاب الزکوٰۃ میں باب ذکر الخوارج و مصفاتہم میں آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ظواہر شریعت میں توبہ و ادب ظاہر کرتے ہیں لیکن اصول دین سے بالکل بے بہرہ ہوتے۔ معذور پر اعتراض کرنے والے شخص نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول پر ایمان لانے کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کی ظاہری نیکی اس کو دین کی حقیقت سے آگاہ کرنے میں ناکام رہی۔

(مترجم)

